اورنگزیب یوسفزئی جنوری 2017

زکوٰۃ، صدقات اور خیرات کی حقیقی قرآنی تعریف

بیرونِ ملک سے استفسارات کے جواب میں

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

دورِ حاضر کے مسلم معاشروں میں زیرِ عنوان تینوں قرآنی اصطلاحات کی کافی مبہم اور غیر علمی تعبیرات و تشریحات مروج ہیں۔ اس بڑے سقم کے باعث سوچ رکھنے والے اذہان کے لیے ان اصطلاحات پر مبنی احکامات کا عملی زندگیوں پر اطلاق کئی سوالات اور الجھاوے پیدا کر دیتا ہے۔ یہ مسلم دنیا کا ایک بڑا المیہ ہے کہ ۱۴۰۰ سال کا عرصہ گذر جانے کے باوجود آج بھی ان اصطلاحات کی حقیقی قرآنی تعبیرات کے بارے میں ایک عام مسلمان سے لے کر نام نہاد علماء تک باہمی اختلاف، شش و پنج اور غیر یقینی کیفیت کا شکار ہیں۔ اور علمی اور شعوری ترقی کے حامل اِس جدید دور کی استقرائی منطق[Inductive Logic] اور جدلیاتی عقلیت [Dialectic Rationalism] کے معیار پر اُترنے والا کوئی بھی حتمی اور متفقہ فیصلہ عوام کی نظروں کے سامنے عام فہم انداز میں موجود نہیں ہے۔

بیرونِ ملک کے پاکستانی حلقوں کی جانب سے، بذریعہ موقر قرآنی جریدہ "صوت الحق" کراچی، یہ مطالبہ کیا جاتا رہا ہے کہ قرآن کی حقیقی روشنی میں ان بنیادی سوالات کا اطمینان بخش جواب پیش کیا جائے تاکہ غیر معاشروں میں رہتے ہوئے روزمرہ کی زندگی میں قرآن کے دائمی ضابطۂ سیرت و کردار پر عمل کرنا آسان اور شک و شبہ سے بالاتر ہو جائے۔ کیونکہ اسلامی مذہبی / سیاسی اقلیم میں تمام تر گذشتہ ادوار میں خالص علمی اور عقلی تحقیق و تفتیش اور انکشاف و دریافت کے میدان جان بوجھ کر شجرِ ممنوعہ بنا دیے گئے تھے، اور ایسا کرنے والے معدودے چند دانشوران کی زندگیاں عقوبت و صعوبت کا شکار بنا دی جاتی تھیں، اس لیے اسلام میں حقیقی "فکر" [thought, reason] کے لیے اور ایک حقیقی مسلم مفکر کے افکار کی نشر و اشاعت کے لیے کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ ہمیں بتایا یہ گیا تھا کہ مذہب کی بنیاد ایمانیات پر ہوتی ہے اور ایمان [faith] اور فکر [Reason] دو متضاد چیزیں ہیں۔ ایمان کسی بات کو بلا سوچے سمجھے مان لینے کو کہتے ہیں۔ دریں احوال مسلم مفکر کی تو اصطلاح ہی [self-contradictory] ہے۔ یعنی اگر وہ مسلم ہے تو مفکر نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ مفکر ہے تو مسلم نہیں ہو سکتا۔ البتہ ما قبل سے مروجہ اندھے عقائد کی تائید و تکرار میں استخراجی منطق کو استعمال کرتے ہوئے جتنا

بھی لکھا جا سکتا تھا وہ بالا دست طبقات کی خوشنودیِ طبع کا باعث تھا اور ایسی تحریروں کے دریا بہا دینے پر کوئی پابندی عائد نہ تھی۔ اسلاف کی بیشتر تحریروں میں موجود یہی لایعنی اور مبہم "علم الکلام" آج ہمارا کُل مذہبی سرمایہ ہے۔

البتہ عصرِ حاضر میں ہمارے گرامی قدر اساتذہ نے بہت سے کٹھن اور حل طلب قرآنی موضوعات پر کام کیا ہے اور قرآن کے طالب علموں کے لیے بہت کچھ قیمتی ورثہ اپنی تحریروں میں پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ زکوٰۃ کے موضوع پر استادِ محترم علامہ پرویز نے نہایت دقتِ نظر کے ساتھ تحقیق کا کام کیا ہے اور اسے حقیقی قرآنی روشنی میں انسانی ارتقاء کے لیے، جملہ اسبابِ نشو و نما کی بہم رسانی سے تعبیر کیا ہے۔

دراصل اسلامی تہذیب میں زکوٰۃ، صدقات اور خیرات کے تینوں ہی امور کا مروجہ موروثی تصور ایک مالی عطیے یا ادائیگی (charity) کی شکل کا حامل ہے جو خود اختیاری طور پر غرباء و فقراء اور سوالیوں کو عموماً" دی جانے والی بھیک، اعانت و امداد وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سوائے اس کے کہ دیگر کے برعکس، زکوٰۃ نام کی عطا کو ایک علیحدہ اور منفرد مذہبی فریضے کی (mandatory) حیثیت دے دی گئی ہے۔ زکوٰۃ کا یہ فریضہ ہر صاحبِ نصاب پر سال میں ایک بار اس کی جمع شدہ ملکیتی اموال پر ایک مخصوص شرح کے مطابق لاگو ہوتا ہے۔ صاحبِ نصاب سے مراد زکوٰۃ دینے کا اہل، صاحبِ حیثیت انسان قرار دیا گیا ہے۔

آیئے اب احکاماتِ الٰہیہ پر مبنی ان تینوں اصطلاحات کو ان کی انفرادی حیثیت میں علیحدہ علیحدہ خالص قرآنی روشنی میں تحلیل و تجزیے کے مراحل سے گذار لیتے ہیں تا کہ ان کے اصل معانی میں پوشیدہ صدقِ بسیط واشگاف انداز میں سامنے آجائے اور ہمیشہ کے لیے شرحِ صدر کا موجب بنے۔

زکوٰۃ

زکوٰۃ کس نے، کس کو، کتنی مقدار اور کس انداز میں دینی ہے اس ضمن میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ علماء و فقہاء کی اکثریت کے مطابق زکوٰۃ غرباء، مساکین، ضرورت مندوں کو امداد کے طور پر صاحبِ حیثیت طبقے کی جانب سے براہِ راست دی جاتی ہے۔ کچھ دیگر کے مطابق یہ حکومت کو بطور ٹیکس ادا کی جاتی ہے۔ البتہ صرف پاکستان شاید ایک ایسا اسلامی ملک ہے جہاں حکومت زکوٰۃ کے نام پر مختص ایک خاص رقم کو جبری خیرات کے طور پر ایک مذہبی ٹیکس کی صورت عوام کے بنک اکاؤنٹس سے منہا کر لیتی ہے۔ اس کا جواز یہ دیا جاتا ہے کہ اس رقم سے ایک فنڈ قائم کیا جائیگا جس کے ذریعے غرباء کی مدد کی جائیگی۔ یہ شاید زکوٰۃ کا دنیا بھر میں سب سے زیادہ استحصالی تصور ہے کیونکہ اس کے تحت اندھے کی لکڑی چلانے والا کام کیا جاتا ہے، اور مقررہ تاریخ سیونگ اکاؤنٹ میں جو بھی رقم موجود ہو، خواہ وہ ایک سال کی مطلوبہ مدت پوری بھی نہ کر پائی ہو، یا ابھی صرف ایک ماہ قبل ہی جمع کرائی گئی ہو، اور اکاونٹ خواہ کیسے ہی غریب اور مستحقِ زکوٰۃ انسان کا ہو، اس پر بھی یہ جبر یہ سلب و نہب لاگو کر دیا جاتا ہے۔

اسلامی فقہ میں زکوٰۃ کی ادائیگی کی شرح نقد رقم یا مال و اسباب پر ڈھائی فیصد مقرر کی گئی ہے۔ سونے یا زیورات پر یہ تب لاگو ہو جاتی ہے کہ سونا ساڑھے سات تولے سے زائد ہو اور روزمرہ کے استعمال میں نہ ہو،اور چاندی 52 تولے سے زائد ہو۔ البتہ روزمرہ کے استعمال کے زیورات پر، کام کرتی ہوئی مشینری اور آلات پر،اور اُس تجارتی مال پر جو سال بھر موجود نہ رہا ہو، یہ زکوٰۃ لاگو نہیں ہے۔ یاد رہے کہ زکوٰۃ کا یہ مروجہ تصور اور اس کی مقرر کردہ شرح اللہ تعالیٰ کی کتابِ ہدایت میں عطا کردہ اصول و قوانین سے کوئی تعلق نہیں رکھتے،،، بلکہ ملوکیتی فقہ کی میراث ہیں۔ اسی لیے ان کا نہ کوئی عقلی جواز ہے نہ منطق۔ یہ تلوار کے زور پر، اور جبر اور دھاندلی کے ذریعے نافذ العمل کیے گئے تھے۔ اور آج اپنا ایک طویل تواتر اور تسلسل رکھتے ہیں۔ یہ سرمایہ داری نظام کو تقویت پہنچاتے ہیں اور غریب کو مزید مذہبی استحصال کا شکار بناتے ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان اِن رسوم و رواج کی فی زمانہ ایک اندھے عقیدے (blind dogma / conviction) کی مانند پیروی کی جاتی ہے۔ شاید اسی صورتِ حال کے بارے میں کافی سوچ بچار کے بعد حضرت اقبال نے اپنا تجزیہ کچھ ان الفاظ میں پیش کر دیا تھا:- " تا تنہ و بالا نہ گردد ایں نظام،،،،،،،، دانش و تہذیب و دیں سودائے خام"۔

مضمون کے اواخر میں فقہ کی رُو سے نافذ کیے گئے زکوٰۃ کے نام نہاد اصولوں کے مضحکہ خیز عملی اطلاق کا مختصر نمونہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائیگا۔ اس کے عددی حساب کتاب کو آپ کے سامنے پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا جائیگا کہ یہ مروجہ تصور نہ صرف قرآن کے منافی ہے بلکہ غیر عقلی (irrational) ہے، انصاف و انسانیت کے تمام اصولوں کی دھجیاں اُڑاتا ہے، غریب کے ساتھ ظالمانہ امتیازی سلوک کرتے ہوئے اسے ناجائز ادائیگیوں کا مکلف بناتا ہے۔ اور صرف طبقۂ امرا کے مال و دولت کے ارتکاز کے راستے میں موجود تمام دینی رکاوٹیں دور کرنے کا ایک کارآمد فارمولا ہے۔

اب آیئے عربی لغات کی مدد سے لفظ زکوٰۃ کی اصل روح کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ عربی زبان نہایت وسعت کی حامل ہے۔ اس سے دیگر زبانوں میں ترجمہ کرنے کے لیے اس کے ہر لفظ کے وسیع معانی کی پوری وسعت (range) کو مدّ نظر رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے کیونکہ اکثر مواقع پر اس کا ایک اُردو مرادف (equivalent) اس کی پوری تعبیر (definition) واضح نہیں کر سکتا۔ ایک عربی لفظ کے معانی کی دیگر زبانوں میں منتقلی کے عمل میں اکثر و بیشتر اس کے دو، تین یا چار تک مرادفات درج کرنے کی ضرورت لازم آجاتی ہے تاکہ اس کے مافی الضمیر کا مکمل احاطہ کر لیا جائے۔

یہاں ضمنی طور پر یہ ذکر کر دیا جائے تو غیر متعلق نہ ہوگا کہ ہمارے کئی سینیئر اساتذہ کا یہ کہنا درست نہیں کہ عربی زبان کی وسعت کے باعث قرآن کا راست ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان گنت نامی گرامی شخصیات کے انگلش اور اردو تراجم میدان میں موجود ہیں جن سے وسیع پیمانے پر مستقل استفادہ کیا جاتا ہے۔ ہر ایک ترجمہ مترجم کی ذہنی سطح، علمی استعداد اور اعتقادات کی عکاسی کرتا ہے۔ انفرادی سطح پر کام کرنے کے باعث، اور دوسری جانب قدیمی تفاسیر سے مطابقت اور ہم آہنگی کی ذہنی خواہش کے سبب، یہ تراجم باہم اختلافات کا شکار بھی ہیں اور اندھی تقلید سے پیدا ہونے والی جامد فکر کے حامل بھی۔ بنابریں یہ تراجم ایک حکومتی لیول کی اجتماعی اور ہمہ گیر

سطح پر کام کرنے اور آزادیِ فکر کی ضرورت کا تقاضا بھی کرتے ہیں۔ حقیقتِ احوال یہ ہے کہ اگر تمام متعلقہ امور اور زبان دانی کی باریکیوں کو مدِ نظر رکھ لیا جائے تو ٹیم ورک اور آزادیِ فکر کے ساتھ بالکل ایک ایسا سیر حاصل ترجمہ اخذ کیا جا سکتا ہے جو قرآنی کلام کی روح اور نچوڑ سے مکمل مطابقت رکھتا ہو۔ راقم الحروف نے بذاتِ خود یہ عملی تجربہ قرآن کے موضوعاتی تراجم کا ایک خالص تحقیقاتی سلسلہ جاری کرنے کے باوصف بارہا حاصل کیا ہے اور اس کے سو فیصد قابلِ عمل ہونے کی ان گنت شہادتیں بھی اربابِ عقل و نظر سے حاصل کر چکا ہے۔(اس سلسلے کی 35 اقساط اب تک جاری ہو چکی ہیں)۔ وہ اساتذہ جو اس امر کو ناممکن الحصول قرار دیتے ہیں ایک کھلے تضاد کا شکار ہیں، کیونکہ خود ان کی اپنی تحریریں انہی کے کیے ہوئے راست تراجم سے بھری پڑی ہیں۔ اور یہ محترم فاضلین جو صرف مفاہیم، یا بالفاظ دیگر، تفاسیر کی وکالت کرتے ہیں یہ حقیقت نظر انداز کرتے رہے ہیں کہ مفاہیم تو دراصل ذاتی خیالات، تصورات و نظریات کی ترجمانی کرتے ہیں اور صاحبِ کتاب کے برعکس صاحبِ تفسیر کی فہم پیش کرتے ہیں۔ حقیقی قرآنی فہم تو کسی انسانی آمیزش سے مبرّا، ایک اعلیٰ اور ارفع ترین الہامی فہم ہے جسے بعینہٖ صرف ایک ٹھوس اور منضبط ترجمے کی رُو سے اُردو زبان میں منتقل کر دینا چاہیئے۔ اس میں کسی ذاتی انسانی فہم کا، ذاتی الفاظ میں اظہار شامل کر دینا "تحریف" کی ذیل میں آتا ہے۔ یہ گناہ ہے اور حدود فراموشی ہے۔(دیکھیں راقم الحروف کی تحقیق: "تفسیر نویسی-ایک فن یا حدود فراموشی کا جرم")۔

اس پسِ منظر کی وضاحت کے بعد اب آیئے اپنے موضوع کی تفہیم کی جانب خالص علمی اور عقلی انداز میں آگے بڑھتے ہیں۔

زکوٰۃ: ز۔ک۔و اس کا مادہ ہے جس کا معنی ہے: وہ بڑھ، پھیل گیا؛ اس میں اضافہ کر کے مکمل کر دیا گیا؛ وہ پھلا پھولا / اچھی نشو نما پا گیا/ فراوانی پا گیا/ خوشحال ہوا / وہ ثمر بار ہوا۔ اسی مادے سے مشتق ہے ہمارا موضوع یعنی زکوٰۃ۔ مادے کے معنی کی رُو سے اس مشتق کا معنی ہو گا: ذرائع و اسبابِ پرورش، بڑھوتری، ترقی، نشو و نما، خوشحالی۔ یاد رہے کہ نشو و نما میں جسمانی اور ذہنی پرورش و ارتقاء دونوں شامل ہیں۔ یعنی خوراک و رہائش سے لے کر حصول تعلیم تک۔

مادے "ز ک و" کے معنی کی ایک دوسری جہت بھی ہے جو کچھ اس طرح ہے: وہ خالص اور پاک ہو گیا/ اچھائی / راست بازی اختیار کی؛ اسے ایک درست اور صحیح حالت میں لایا۔ نیز ایک تیسری جہت بھی آپ نوٹ فرمائیں گے جو صاف طور پر ملوکیتی تفاسیر کے زیرِ اثر اس کے معانی میں شامل کی گئی باور ہوتی ہے، یعنی" خیرات، واجبات / ٹیکس"۔۔۔۔۔ معانی کی یہی وہ تیسری کمزور جہت ہے جسے زکوٰۃ کے معانی میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنے کے لیے تمام تفاسیر و تراجم میں عمومی طور پر استعمال کیا گیا اور بھرپور شہرت دی گئی ہے کیوں کہ یہ ملوکیتی حکومتوں کو عوام کی ضروریات پر بیت المال سے خرچ کرنے سے صاف بچا لیتی تھی۔ درجِ بالا اولین جہت کو بالعموم نظر انداز کیا گیا کیونکہ یہ بادشاہوں کے خزانوں سے عوام کا حق انہیں بن مانگے بہم پہنچانے کا حکم دیتی تھی۔ وضاحت آئندہ سطور میں آپ کے سامنے آ جائیگی۔

" زکوٰۃ" بھی "صلوٰۃ" ہی کی مانند قرآنِ عظیم کی ایک اہم ترین اصطلاح ہے۔ آپ نوٹ کریں گے کہ اپنی اسی ہیئت میں، اسم کے صیغے میں، مادہ - ز ک و- کا یہ مشتق، معدودے چند استثناؤں کے ساتھ تقریباً ہمیشہ ہی قرآنی فرمان "اقیموا الصلاۃ" کے ہمراہ ، "و آتوا الزکوٰۃ" کی ترکیب میں صادر کیا گیا ہے۔ ان دو اوامر کا استمرار کے ساتھ باہمی ربط کے ساتھ وارد ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ دونوں اوامر لازم و ملزوم ہیں۔ یعنی ان دونوں احکامات کا باہم ارتباط کے ساتھ نفاذ کیے بغیر دینِ الٰہی کا قیام مکمل نہیں ہو سکتا۔

آسان الفاظ میں یوں سمجھیے کہ "اقیموا الصلاۃ" ، یعنی پیرویِ احکام الٰہی کے قیام،،،، کے ہمراہ،،، "آتوا الزکوٰۃ" ، یعنی ذرائع و اسبابِ پرورش، اسبابِ ترقی اور نشو نما کا عام کر دینا،،،،، قرآنی ڈسپلن میں لازم قرار دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ یہاں اگر درمیانی "و" کو واؤ عطف کی بجائے "یعنی" کے معانی میں بھی لے لیا جائے تو قرآن کا مافی الضمیر اُسی طرح واضح رہتا ہے۔ اور دونوں احکامات کا باہمی لزوم اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ایک آیتِ مبارکہ پیش کر دی جاتی ہے:-

آیت **110/2:** و اقیموا الصلاۃ و آتُوا الزکاۃ و ما تقدّموا لانفُسِکُم من خیر تجدوہ عند اللہ۔ انّاللہ بما تعملون بصیر۔

ترجمہ: اور الصلاۃ یعنی احکاماتِ الٰہی کی پیروی کو قائم کرو اور اسی کے اتباع میں "اسبابِ پرورش و نشو نما" عام کر دو۔ اس لیے کہ جو بھی تم اجتماعی طور پر مالِ خیر میں سے اپنے لوگوں (عوام) کے لیے پیش / فراہم کروگے، اپنا یہ عمل تم اللہ کی نظروں کے سامنے پاؤ گے۔ در حقیقت جو بھی اعمال تم سرانجام دیتے ہو اللہ کا قانون انہیں مستقل اپنی نظر میں ہی رکھتا ہے۔

اسی انداز میں یہ دونوں باہم مربوط احکامات تقریباً 25 آیاتِ کریمات میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں جنکے، طوالت سے بچنے کے لیے، صرف حوالہ جات دے دیے گئے ہیں جو اس طرح ہیں: 43/2، 83/2، 110/2، 177/2، 277/2، 77/4، 162/4، 12/5، 15/5، 5/9، 11/9، 18/9، 71/9، 31/19، 55/19، 73/21، 41/22، 78/22، 56/24، 3/27، 4/31، 33/33، 13/58، 20/73، 5/98۔

اب یہاں قرآنی حلقوں میں بھی یہ بہت بڑا نکتہ زیرِ بحث ہے کہ زکوٰۃ فراہم کرنے کے یہ بالتکرار احکامات آخر معاشرے کے کس خاص طبقے کو مخاطب کر کے جاری کیے جا رہے ہیں،،،،، یا کیا مجموعی طور پر یہ تمام معاشرے یعنی عوام و خواص دونوں طبقات پر لاگو ہوتے ہیں؟۔۔۔۔ جب ہم یہ امر نوٹ کرتے ہیں کہ یہ احکامات ہمیشہ ہی "اقامت الصلاۃ" کے حکم کے ہمراہ آتے ہیں، تو غالب امکان یہی سامنے آتا ہے کہ یہ احکامات مقتدر طبقے کے لیے ہی مخصوص ہیں۔ "صلاۃ"، یعنی اللہ کے احکامات کی پیروی کا قیام کیونکہ مقتدر طبقے ہی کے فرائض میں آتا ہے کیونکہ وہی اربابِ بست و کشاد ہوتے ہیں اور ریاست کے وسائل و اختیارات کے حامل ہوتے ہیں، اس لیے لامحالہ زکوٰۃ کی فراہمی بھی انہی کی ذمہ داری ہے۔ یہ اس لیے کہ پوری قوم کے ضرورت مندوں کو اسبابِ نشو و نما اور ارتقاء (زکوٰۃ) صرف ایک ریاست ہی فراہم کر سکتی ہے۔ طبقہِ امراء سے تعلق رکھنے والے ایک قطعی اقلیت ہوتے ہیں اور ایسے چند افراد اپنے مال کی

مروجہ ڈھائی فیصد زکوٰۃ کے ساتھ ایک پوری قوم کی نشوونما کے ذمہ دار بننے کی قدرت ہی نہیں رکھتے۔ ایک معروف آیتِ مبارکہ اس قرآنی نظریے کو بھرپور تقویت دیتی ہے جسے یہاں درج کر دیا جاتا ہے:-

الحج/41: الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ---- ترجمہ: ۔۔۔۔یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین پر تمکن یعنی اختیار عطا کر دیں تو یہ احکامِ الٰہی کی پیروی قائم کر دیں گے اور اسبابِ نشوونماو پرورش کی فراہمی عام کر دیں گے۔ اور ہر جانی بوجھی اچھائی کا حکم دیں گے اور برائی کو ممنوع کر دیں گے۔ اس طرح ان تمام معاملات کا خوشگوار انجام / نتیجہ اللہ کی منشاء کے مطابق ہو گا۔

اب غور فرمائیں کہ یہاں "تمکن فی الارض" اور "اَمَرُوا" کے الفاظ خاص توجہ دینے کے لائق ہیں۔ "تمکن فی الارض" کا سیدھا مطلب حکومت کا قیام ہے۔ "امرو"، یعنی حکم کا نافذ کرنا بھی اتھارٹی اور اختیار کی نمائندگی کر رہا ہے۔ بغیر حکومتی اتھارٹی کوئی بھی" امر" یعنی حکم نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ پس یہ بالکل واضح ہے کہ درج بالا احکامات کے تمام حوالے دراصل معاشرے کی ہیئتِ مقتدرہ سے مخاطب ہیں جنہیں حکومتی اتھارٹی حاصل ہے اور وہ احکامات کا نفاذ کرنے کے قابل ہیں۔ فلہٰذا ثابت ہوا کہ زکوٰۃ کی فراہمی کو بھی حکومتِ اسلامیہ کی جانب سے ضرورت مند عوام کے لیے مستقل طور پر کھلا رکھنا ایک لازمی فریضہ ہے۔ یہی وہ فریضہ ہے جس کی ادائیگی سے حکومتیں ایک مثالی اسلامی معاشرے سے بھوک، افلاس، تنگ، جہالت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تمام معاشرتی برائیاں اور جرائم ختم کر دیتی ہیں۔

معاملے کا ایک دیگر منطقی اور شعوری پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ ایتائے زکوٰۃ کا حکم عوام پر اجتماعی طور پر نافذ کیا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ عوام کی اکثریت تو غربت کی لکیر پر یا اس سے نیچے زندگی گذارتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ زکوٰۃ ادا نہیں کر سکتی بلکہ زکوٰۃ وصول کرنے کی مستحق ہوتی ہے۔ ایک چھوٹا سا طبقہِ اُمرا بھی پوری قوم کو دائمی طور پر سامانِ نشوونما فراہم کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اس لیے لامحالہ ایتائے زکوٰۃ کا حکم صرف حکومتِ اسلامیہ ہی کے لیے ہو سکتا ہے، عوام کے لیے حتمی طور پر نہیں ہو سکتا۔ اور یہ وہی سہولت ہے جو مغربی ممالک میں ویلفیئر گرانٹ (welfare money) کی صورت میں حکومتوں کی جانب سے ضرورت مندوں، بیروزگاروں کو ماہ بماہ خودکار طریقے سے ادا کی جاتی ہے۔ اور اس کے ہمراہ بلا معاوضہ تعلیم، ٹرانسپورٹ اور صحت و علاج کی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔

منطقی طور پر، طبقاتی پیراڈائم کے تناظر میں معاملے کا تجزیہ کرتے ہوئے بھی، یہ ناقابلِ تردید دلیل آپ کے سامنے آجائے گی کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں پر لاگو ایسا کوئی بھی اجتماعی قانون نافذ نہیں کر سکتے جس کی تابعداری کسی ہماری جیسی قوم کے 80 فیصد غریب طبقے کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ انسانی معاشروں میں لگ بھگ سٹراسی فیصد عوامی طبقہ تو بمشکل اپنی گذر اوقات ہی پوری کرتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے وہ بھی ہوتے ہیں جو زکوٰۃ کی ادائیگی تو کجا، بلکہ اس کے برعکس زکوٰۃ کے مستحق ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس معروضی

معاشرتی حقیقت کے مطابق سوچیں تو خود بخود آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم تعمیم کا حامل نہیں، یعنی یہ عام انسانوں کے لیے عمومی حکم ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ حکم حکومت ہی کے لیے صادر کیا جا سکتا تھا۔

صدقات

اب اس نکتے پر آخری سوال جو ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ پھر اسلامی حکومت آخر عوام سے کیا وصول کرے جس سے کہ وہ اپنا کاروبار چلا سکے۔ اور ساتھ ساتھ زکوٰۃ یعنی اسبابِ پرورش و نشوونما بھی ضرورت مندوں کے لیے عام کر سکے۔ اس ضمن میں قرآن نے واضح طور پر مینڈیٹ دیا ہے کہ حکمران لوگوں کے اموال پر ٹیکس وصول کرے جس سے کہ ایک طرف تو حکومت سے ان کا خلوص اور خیر خواہی ثابت ہو جائے، دوسرے یہ کہ اسی سے عوام کی نشوونما کی جائے۔۔ اس لازمی وصولی کو قرآن میں "صدقات" کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی صدقات دراصل رحم دلی کی بنیاد پر غربا میں کچھ بانٹ دینے کا معنی نہیں رکھتا۔ ملاحظہ فرمائیں:

آیت9/103: خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۗ ترجمہ: [اے نبی] لوگوں کے اموال پر ان سے ٹیکس وصول کرو۔ اسی کے ذریعے تم ان کے کردار پاکیزہ کرو گے اور اس کے ذریعے تم لوگوں کی پرورش و نشوونما کرو گے۔ اور ٹیکس دینے والوں کی تحسین و آفرین کرو۔ کیونکہ تمہاری یہ حوصلہ افزائی ان کے لیے باعث تسکین و اطمینان ہو گی۔

پس ثابت ہوا کہ عمومی فہم کے برعکس صدقات کوئی بھیک، خیرات، عطیات وغیرہ نہیں جن کا غرباء کو دینا والنٹری حیثیت کا حامل ہو۔ یہ تو صاحبِ حیثیت انسانوں پر لاگو ایک جبری [mandatory] ادائیگی ہے۔ یہی وہ ٹیکس ہے جو اموال اور کاروبار پر مختلف اشکال میں وصول کیا جاتا ہے، جس سے حکومت کا کاروبار چلتا ہے۔ یہ ٹیکس "صدقۃ" Sadaqatun کہلاتے ہیں۔ جیسا کہ9/103 سے مکمل طور پر واضح ہو گیا۔ اب آیئے اتمامِ حجت کے لیے لغات سے بھی اسناد پیش کر دی جاتی ہیں:

اس کا مادہ ہے: ص د ق: وسیع المعانی مادہ ہے جس کا بنیادی معنی سچ کہنا، سچ کر دکھانا، سچائی ثابت کرنا وغیرہ ہے۔ اسی سے مشتق صدقۃ sadaqatan جمع sadaqaat وہ ادائیگی ہے جو اموال کے ایک حصے یا شرح کے مطابق کی جائے جو اس امر کی تصدیق کرے کہ ادائیگی کرنے والا اپنے ایمان و خلوص و فرائض میں سچا ہے۔ مصدق musaddiqun وہ شخص ہے جس سے اس کے مال مویشی پر ایک شرح سے وصولی کی جائے [cattle money] ۔ یہ وصولی اللہ کے نام پر بھی وصول کی جاتی ہے [poor rate] جو حکومتِ الٰہیہ کے خزانے میں جمع ہوتی ہے اور حکومت کے اخراجات پورے کرتی ہے۔

ایک اور ثبوت ملاحظہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ آیت 9 /60 میں یہی ٹیکسز جو صدقات کہلاتے ہیں اور حکومت کے ریوینیو Revenue کی حیثیت رکھتے ہیں، حکومت کے کاروبار میں درست جگہوں پر خرچ کرنے کے لیے نہایت واضح احکامات بھی صادر فرماتا ہے:-

آیت9/60: إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّـهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّـهِ ۗ وَاللَّـهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ۔

ترجمہ: در حقیقت جو ٹیکسز تم وصول کرتے ہو ان کا مصرف یہ ہے کہ وہ محروموں، معذوروں، وصولیوں پر مامور سٹاف، تالیفِ قلوب کے محتاج لوگ، کسی وجہ سے قید میں پڑے ہوئے لوگ، قرضوں میں جکڑے ہوئے لوگوں پر خرچ کیے جائیں، اور اللہ کے احکامات کی تعمیل کی راہ میں، اور ان لوگوں پر جو اس تعمیل کی مہمات کی بجا آوری کروانے پر مامور ہیں [سرکاری اہلکار و ذمہ داران]۔ یہ اللہ کی جانب سے مقرر کردہ ایک بڑا فریضہ ہے کیونکہ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور دانائی کا مالک ہے۔

خیرات

قرآنِ حکیم میں خیر اور خیرات ایسے اچھے کاموں کو کہا گیا ہے جن کے ذریعے انسانوں کی بھلائی کا کوئی مقصد پورا کیا جاتا ہو۔ یہ الفاظ اصلاحی، فلاحی، ترجیحی، قابلِ رشک اور بہتری اور سخاوت کے حامل کاموں کے ایک وسیع تناظر کا احاطہ کرتے ہیں، اور انہیں ہرگز صرف بھیک یا فقیروں اور ضرورت مندوں کو دینے والی خیرات سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ ہمارے معاشرے میں رواج دے دیا گیا ہے۔ قرآن کے ہر مقام پر اس لفظ کا معنی نص کے سیاق و سباق کے مطابق اس کی درجِ ذیل وسعت میں سے ہی منتخب کیا جائے گا۔ آیئے اس اصطلاح کے وسیع معانی پر روشنی ڈالنے کے لیے لغات سے مدد لیتے ہیں۔

مادہ: خ ی ر؛ **Kh-Ya-Ra = Be possessed of good, to do good, give one a choice or option (and also be given a choice or option), prefer one thing or person over another thing or person, preferred/pronounced/chosen, strive to surpass one in goodness, excellent in beauty and disposition, to be ideal (show actual or potential usefulness or benefit), be desired in all circumstances and by every person, exalted in rank or quality or reputation, to be better than another person or thing, be the best of things or people, to be generous (possess and show generosity), possess nobility or eminence, be elevated in state or condition.**

امیدِ واثق ہے کہ تحریرِ ھذا سے زکوٰۃ، صدقات اور خیرات کی قرآنی تعبیر اپنی تمام جہتوں کے ہمراہ معزز قارئین کے سامنے نہ صرف مکمل روشنی میں آگئی ہوگی، بلکہ اذہان میں موجود تمام سوالات کے جوابات بھی واضح ہو کر سامنے آگئے ہوں گے۔ وضاحت کو مختصر رکھنے کے لیے کافی کوشش کی ہے۔ پھر بھی کہیں تشنگی محسوس ہو تو مزید استفسار کیا جاسکتا ہے۔

موجودہ نازک صورتِ حال میں مسلمان قوم کو درپیش مسائل و مشکلات کے بارے میں یہ ناچیز بالعموم استفسارات کے جواب میں یہ شعر پیش کر دیا کرتا ہے:- " غیر ممکن ہے کہ حالات کی گتھی سلجھے،،،،،،،،،،اہلِ دانش نے بہت سوچ کے اُلجھائی ہے "۔

کیونکہ گذشتہ تقریباً ڈیڑھ صدی سے زیادہ طویل عرصے کی مسلسل تحقیق نے یہ امر اب ثابت کر دیا ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب کی اساس جس مذہبِ اسلام پر رکھی گئی ہے یہ وہ حقیقی اور آفاقی دینِ الٰہی نہیں جو ہمارے پیارے رسول محمد [ص] نے متعارف کروایا اور جس کے تحت اُس ذاتِ بابرکات نے ایک انقلاب برپا کرتے ہوئے "الحکم" یعنی ایک خالص حکومتِ الٰہیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کے برعکس آج ملتِ اسلامیہ ایک مصنوعی مذہبِ اسلام کی پیروی میں گُم ہے جسے صرف 35 ہجری میں ہی، یعنی وصالِ نبی پاک کے صرف 24 سال بعد ملوکیت کے قابض ہو جانے پر بالجبر نافذ العمل کر دیا گیا تھا۔ مولانا مودودی کی اہم ترین تحریر "خلافت اور ملوکیت" اس موضوع پر ایک بہترین مطالعہ ہے۔ بعد از تحقیقِ بسیار، اس دو نمبر کے مذہب کو،،، "ملوکیتی اسلام"،،،، کا نام دے دیا گیا ہے اس لیے کہ تمامتر حقائق و شواہد اس امر کی توثیق کرتے ہیں کہ دینِ الٰہی کیونکہ مطلق العنان موروثی بادشاہتوں کی حامل تہذیب کے پہلو بہ پہلو چل ہی نہیں سکتا اور اس طرزِ زندگی کی ضد ہوتا ہے، اس لیے اموی غاصب بادشاہوں نے اس دینِ خالص کو اپنے اولین پالیسی اقدام کے تحت کالعدم کرنا ضروری سمجھا اور اس کا تمام تر حلیہ بگاڑنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ یاد رہے کہ قرآن کی شکل مسخ کرنے کے لیے اور ملوکیتی اسلام کی تشکیل کے مقصد کے تحت، بلاضرورت وجواز قرآن کی تفاسیر لکھوائی گئیں جن کی رُو سے حقائق کو کچھ سے کچھ کر دیا گیا۔ نیز اسی کے متوازی ایک اور مقدس کلام اختراع اور ایجاد کیا گیا جسے حدیثِ رسول کا نام دے دیا گیا۔ مقصود یہ تھا کہ بعد ازاں آنیوالے زمانوں میں قرآن کی اہمیت بتدریج گھٹا کر وضعی احادیث کو ہی بڑے مجموعات کی شکل میں مرتب کر کے دین کی اساس کے طور پر اختیار کر لیا جائے۔ قرآن کو امتدادِ زمانہ کے ساتھ گمنامی کے ایسے اندھیروں میں پھینک دینا اس مہم کا ہدف تھا کہ جہاں اسے صرف تلاوت کرنے اور اس طرح ثواب کمانے کا ذریعہ سمجھ لیا جائے۔

اسی مذموم مہم کے ذریعے تقریباً تمام اہم ترین قرآنی اصطلاحات کے بلند و بالا معانی کو انتہائی عامیانہ انداز میں ایک بازاری زبان میں تعبیر و تفسیر کر دیا گیا۔ قرآن جو عربیِ معلیٰ کا ایک شہ پارہ تھا اور ایک اعلیٰ وارفع ادبی زبان میں نازل کیا گیا تھا جو علمی استعارے، تشبیہ، محاورے، ضرب الامثال اور مجازی و علامتی الفاظ و اصطلاحات سے لیس تھی، لفظی تراجم کے ایک غیر علمی، غیر معتبر اور ناپسندیدہ طریقِ کار کا بے محابہ استعمال کرتے ہوئے اس کا درجہ گھٹا کر ایک بازیچہِ اطفال کی شکل میں ڈھال دیا گیا۔ اسی مہم کی زد میں "صلوٰۃ" کی اہم ترین اصطلاح بھی آئی اور اسے صرف ایک پرستش کے عمل تک محدود کر دیا گیا (مطالعہ فرمائیں کتابچہ: "تحقیقِ نماز و صلوٰۃ")۔ نیز "زکوٰۃ" کا بھی حلیہ بگاڑ کر اسے حکومتِ الٰہیہ کی جانب سے عوام کے لیے وسائلِ نشوونما کی فراہمی کی بجائے، اُلٹا

عوام کی جانب سے حکومت کو ادا کیا جانے والا ایک ٹیکس، یا اللہ کے نام پر اُمراء کی جانب سے غرباء کو دی جانے والی انفرادی خیرات قرار دے دیا گیا جو انسانیت کی تذلیل کے مترادف ہے۔

اب آخر میں مروجہ غیر قرآنی زکوٰۃ کی کارفرمائیوں کا ایک مختصر جائزہ آپ کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے جس کے بعد اس موضوع پر اپنا فیصلہ خود کرنے میں آپ کو کوئی بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ ہو گی۔

1) 52 تولے چاندی سے زیادہ زیور: فرض کرلیں 60 تولے چاندی کا زیور: قیمت 60 ضرب 600 روپے فی تولہ، مساوی: 36000 روپے۔ یعنی صرف 36000 روپے مالیت زیور کا مالک ایک غریب آدمی یا عورت جس نے بمشکل اپنا پیٹ کاٹ کر یہ معمولی زیور اپنی بیٹیوں کی شادی کے لیے پس انداز کر رکھا ہے، وہ بے چارہ اس معمولی اثاثے پر ڈھائی فیصد زکوٰۃ ادا کرنے کا پابند ہے۔

2) 7 تولے سونے کے زیور کا مالک: قیمت: 7 ضرب 43،900 روپے فی تولہ، مساوی: 3،07،300 روپے۔ یعنی تین لاکھ سے زائد مالیت کے زیور کا مالک شخص، جو ایک صاحبِ حیثیت انسان ہے، بالکل بھی زکوٰۃ ادا کرنے کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ اگر وہ اس سے زیادہ بھاری مالیت کا زیور رکھتا ہے اور اسے زیرِ استعمال ظاہر کر دیتا ہے، تو بھی اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

3) ایک فیکٹری کا مالک جس کی ملکیت میں کروڑوں روپے کا پلانٹ اور مشینری ہے، جس کے ذریعے وہ روزانہ لاکھوں کا مال تیار کرتا اور فروخت کرتا ہے، وہ اُس بڑے اثاثے پر کوئی زکوٰۃ ادا کرنے کا پابند نہیں ہے۔

4) ایک چرب زبان اور کامیاب دکاندار جو اپنا مال ہر ماہ فروخت کرلیتا ہے، اور سال میں 12 مرتبہ اپنی سرمایہ کاری کا سرکل کامیابی سے چلا کر لاکھوں کماتا ہے، اُسے ل لاکھوں یا کروڑوں کے مال پر کوئی زکوٰۃ واجب الادا نہیں ہے۔

5) اس کے برعکس ایک ناکام دکاندار جو اپنا مال فروخت کرنے میں فیل ہو جاتا ہے اور کمائی نہ ہونے سے غربت سے دوچار ہے، وہ اپنے اُسی رُکے ہوئے مال پر ایک سال پورا ہو جانے پر زکوٰۃ بھی ادا کرنے کا پابند ہے۔

6) یہ تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ ہر غریب آدمی اپنا پیٹ کاٹ کر اپنے اہل و عیال کی ناگہانی ضرورتوں اور حادثات کے لیے جو کچھ پس انداز کرتا ہے، اور اس کی خاطر تمام تر تکلیفیں برداشت کرتا اور عسرت کی زندگی بسر کرتا ہے، وہ بھی مجبور ہے کہ اُس بمشکل حاصل کردہ بچت پر ہر سال ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرے، ورنہ اس کا یہ "مال" حلال نہ رہیگا۔

معزز قارئین، یہ ہے مروجہ اسلامی فقہ کے مطابق ترتیب دی اہوا زکوٰۃ کا قانون اور اس کی ظالمانہ کارفرمائیاں، جن کے باعث قدرت نے اس قوم پر فضیلت کی راہیں بند کر دی ہیں۔ دل و دماغ پر مہریں لگ چکی ہیں۔ ساری امت رسوائیوں اور جگ ہنسائیوں

کی ایک بے توقیر راہ پر بصارت و بصیرت سے محروم گامزن ہے۔ عدل و انصاف کی وہ فصلِ بہار جو عالی مرتبت رسول اللہ نے اپنے دستِ رحمت آفریں سے پروان چڑھائی تھی، مسلم زمینوں پر اس کا کوئی نقشِ دل پزیر آج دکھائی تک نہیں دیتا۔ بے شک اس قوم میں ایک مختصر استحصالی طبقہِ امرا و مقتدرین موجود ہے جو عیش و عشرت پر مبنی قابلِ رشک زندگیاں گذار رہا ہے، لیکن اپنی قوم کے مجموعی زوال و پسماندگی کے بھیانک اثرات ساتھ لیے وہ بھی بین الاقوامی انسانی برادری میں اپنے ماتھوں پر داغِ تذلیل سجائے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیے پھرتا ہے۔ اقبال جیسے محرمِ رازِ درونِ میخانہ نے یہ نوحہ دل کی گہرائیوں سے ایک گہرے اور مایوس کُن غور و فکر کے بعد ہی پڑھا ہو گا کہ:-

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات۔